نصابِ اُردو برائے ثانوی تعلیم (نہم ودہم) تدریسی مسائل کے آئینے میں

محمد خرم یاسین

M. Khuram Yasin

Scholar, Ph.D, Urdu,

Govt. College University, Faisalabad

Abstract:

"Curriculum is the key to gain targeted goals of study. It plays most significant and vital role to ensures the future progress of a nation and state. Therefore, while designing curriculum, it is mandatory that it should fulfill and meet the challenges of cognitive developments and requirement of students at anylevel. Urdu is national language of Pakistan but other mother language like Punjabi, Sindhi, Balochi and Pashto are also present there. Therefore, it was necessary to design the Urdu curriculum at secondary level in such a way that it meets all the requirements of students, but unfortunately, it is not designed according to the said aspects and cognitive domains of students. In this article, the practical teaching and studying problems of present curriculum of Punjab Text Book Board for Secondary School Level are discussed."

وہ زمانے لد گئے جب زیادہ بم بارود اور توپ گولے دنیا میں عزت اور فتح کی علامت قرار دیے جاتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں نئے ڈسکورس (Discourse) سامنے آئے اور طاقت کا توازن برقرار رکھنے یا اقوام عالم پر تسلط قائم کرنے کے لیے ایک یکسر نیا فارمولا ''سافٹ پاور'' (Soft Power) وجود میں آیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد پیراڈائم شفٹ (Paradigm Shift) نے سافٹ پاور کے تصور کو تقویت بخشی اور وہی اقوام عالم کامیاب کہلائیں جن کی خارجہ حکمت عملی مستحکم اور مضبوط، معیشت بہتری سے بہترین کی جانب گامزن، درآمدات کم اور برآمدات زیادہ، دوسری اقوام عالم کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت اور ان سب سے بڑھ کر سافٹ وئیر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں لاجواب تھیں۔ اگر سافٹ پاور کی بنیاد پر غور کیا جائے تو اس میں مضمر عناصر، تعلیم کی ضرورت واہمیت کی جانب توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ تعلیم ایک قوم کو اس کے

پاؤں پر کھڑا کرنے اور مقررہ اہداف و مقاصد تک پہنچانے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ جب حصولِ تعلیم کے لیے ذریعۂ تعلیم کی بات کی جاتی ہے تو قومی اور مادری زبانیں بنیادی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت بھی ہے اور صنعت و حرفت میں چین ایسی تیزی سے بڑھتی اقوام کی امثال بھی پیشِ نظر ہیں کہ کوئی بھی قوم اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر ترقی کا تصور نہیں کر سکتی۔ مستعار زبانیں، ترقی کی رفتار میں معاون تو ثابت ہو سکتی ہیں لیکن اسے بنیاد فراہم کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ اُردو کا المیہ یہ ہے کہ قومی سطح پر اس کا اطلاق و انطباق ہمیشہ سے مسائل کا شکار رہا ہے۔ اردو بطور ذریعہ تعلیم کی قومی حیثیت تسلیم کی جانی چاہیے تھی لیکن نہ تو ابتدائی بنیادی تعلیم (پرائمری) کی سطح پر اس کی تدریس کے مسائل کو مکمل طور پر حل کیا گیا، نہ ثانوی تعلیم (سیکنڈری) کی سطح پر اور نہ ہی اعلیٰ ثانوی تعلیم (گریجوایٹ و پوسٹ گریجوایٹ) کی سطح پر۔ پاکستان ایسا ملک جہاں چار صوبوں میں سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی ایسی چار مختلف مادری اور دیگر بہت سی ذیلی زبانیں موجود ہیں، وہاں پرائمری سطح پر اُردو لکھنے سے زیادہ بولنے کی تدریس سے تعلق رکھتی ہے لیکن مؤخر الذکر پہلو پر ہمیشہ کم توجہ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے بھی چار واضح اور متفرق لہجے سننے میں آتے ہیں۔ پرائمری تعلیم کی سطح پر بچوں کے لیے اُردو نعتیں، ملی نغمے، نظمیں اور آسان کہانیاں یا اُردو زبان میں لوک کہانیاں اس کمی کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں لیکن نصاب میں ان پر کم توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ سیکنڈری سطح پر زبان بولنے کے ساتھ ساتھ سمجھنے اور تخلیقی رویوں کو پروان چڑھانے کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے قواعد کی بہتر تفہیم بھی اسی درجے میں ہونی چاہیے اور تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر بھی نصاب کا لازمی حصہ ہونا چاہیے تھی۔ اسی طرح ہائر سیکنڈری، گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ سطح پر زبان کی تفہیم، تخلیقی رویوں کی فراوانی، عملی ترجمہ کاری اور تحقیق زبان و ادب ایسے رجحانات کو فروغ ملنا چاہیے تھا لیکن اس ضمن میں خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا۔ بدقسمتی سے اُردو زبان کے حوالے سے غیر ذمہ دارانہ رویے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ جامعات کی سطح پر بھی اُردو کے حوالے سے تخلیقی رویوں کو پروان چڑھانے، تقطیع، غنائیت، تغزل، تحت اللفظ ادائی اور عملی ترجمہ کاری ایسے اہم عوامل پر کم توجہ مرکوز کی گئی جس سے طالبِ علم ڈگری لینے کے بعد عملاً اُردو دان، شاعر و ادیب اور ترجمہ کار بننے سے محروم رہے۔ مزید یہ کہ اردو زبان و ادب کو اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی طرز پر ہر شعبہ تعلیم میں بطور مختصر مضمون نہیں پڑھایا گیا جس سے ہر جانب انگریزی لفاظی اور اصطلاحات کا دائرہ پھیلتا گیا اور یہ سب کچھ تا حال جاری ہے۔ گو کہ اُردو کے اطلاق و انطباق کے مسائل کی ایک لمبی فہرست موجود ہے لیکن یہاں محض ثانوی درجہ تعلیم یعنی نہم دہم کی اُردو کتب کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے تا کہ نصاب ساز اداروں کو ان کے عملی تدریس کے مسائل سے آگاہی ہو سکے یا اس حوالے سے ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے طلبہ میں اُردو کا ذوق و شوق بھی پیدا ہو اور پڑھنے میں بھی آسانی پیدا ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ تعلیمی نصاب (Curriculum) تعلیمی دورانیے اور اس کے مقاصد کا تعین کرتا ہے اس لیے یہ تعلیمی عمل میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ نصاب طلبہ کی ذہنی استعداد کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں نصاب کے معانی یوں بیان کیے گئے ہیں:

''جڑ۔ بنیاد۔ پڑھائی کا کورس۔ گنجینہ تعلیم۔ جانچ۔ تول۔ معیار۔ کسوٹی۔''(۱)

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی اُردو کتاب برائے جماعت نہم کا نصاب دو اجزا پر مشتمل ہے؛ درسی کتاب اور قواعد و انشا۔ درسی کتاب بارہ اسباق، چار نظموں اور چار غزلوں پر مشتمل ہے۔ حصہ نظم و نثر دونوں میں ہر سبق، نظم یا غزل سے قبل مصنف اور شاعر کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بورڈ کے امتحانات میں اس تعارف میں سے مختصر سوالات اور معروضی سوالات آتے ہیں۔ یہ

تعارف نہم جماعت کے طالب علموں کے سمجھ اور فہم کے لحاظ سے خاصا مشکل ہے کیوں کہ اس میں مشکل اصطلاحات کا برملا استعمال کیا گیا ہے۔ پہلا سبق ''ہجرتِ نبوی ﷺ'' مولانا شبلی کی تحریر کردہ ''سیرہ النبی ﷺ'' سے لیا گیا ہے اور دو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ اس حوالے سے عمدہ انتخاب ہے کہ سیرۃ کی باقاعدہ پہلی کتاب سے انتخاب ہے لیکن اس میں مشکل الفاظ کی بھرمار ہے۔ سبق سے قبل دیا گیا شبلی نعمانی کے تعارف کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''شبلی نے اگرچہ متنوع موضوعات مثلاً: تاریخ، تنقید، سوانح، سیرت، تذکرہ، ادب، معاشرت، عقائد، تصوف اور سیاست پر قلم اٹھایا مگر ان کے طرزِ اظہار میں ادبیت کی شان موجود ہے۔ جوشِ بیان، ایجاز و اختصار، روانی و برجستگی، محققانہ انداز، غنائیت اور شعریت ان کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ شبلی کی تمام ادبی کاوشوں سے قطعِ نظر، ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ان کا اندازِ بیان ہے۔''(۲)

مذکورہ تعارف میں ''طرزِ اظہار میں ادبیت کی شان، جوشِ بیان، ایجاز و اختصار، روانی و برجستگی، محققانہ انداز، اور غنائیت اور شعریت بطور خواص اسلوبِ بیان'' درجہ نہم کے طلبہ کو سمجھانا ایک مشکل کام ہے کیوں کہ ہر اصطلاح کی تفہیم بذاتِ خود ایک مکمل باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھی کے تعارف میں اگر یہ بھی بیان کر دیا جاتا کہ ان کے سبق کا مآخذ کیا ہے اور اس کی اُردو میں کیا حیثیت ہے تو زیادہ بہتر تھا۔ اسی طرح اس سبق کا جائزہ لیں تو دو صفحات کے سبق میں ایسے خالصتاً ادبی جملے دیے گئے ہیں جنھیں سمجھنے میں طالب علم کو دقت ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''اس وقت جب کہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا لیکن خود وجودِ اقدس ﷺ جوان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لیے حکمِ خدا کا منتظر تھا۔۔۔آج رسول ﷺ کا بسترِ خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتحِ خیبرؓ کے لیے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔۔۔تمام شہر ہمہ تن چشمِ انتظار تھا۔''(۳)

دوسرے سبق ''مرزا غالب کے عادات و خصائل'' کا مآخذ مولانا الطاف حسین حالی کی ''یادگارِ غالب'' ہے۔ اس سبق سے قبل مولانا الطاف حسین حالی کے احوال کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ تعارف گو کہ شبلی کے تعارف کی نسبت آسان ہے لیکن نہم جماعت کے بچوں کے سمجھانے کے لیے نسبتاً مشکل ہے:

> ''حالی کے اسلوبِ بیان کی سب سے نمایاں خوبی مدعا نگاری ہے۔ حالی کی غرض، اپنے مضمون کو ادا کرنے اور اور مطالب کو وضاحت سے پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ ان کی نثری تحریروں میں اعتدال و توازن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ بے جا اختصار اور بے جا طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے، عبارت کو دلکش، سادہ اور مدلل بنانے میں، حالی اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ ہر بات کو سنجیدگی اور عقلیت کے ترازو میں تولتے ہیں اور تخیل و جذبات سے دور رہتے ہوئے اپنے خیالات و حقائق کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے حالی کے نثری اسلوب کو، اُردو نثر کا معیاری اُسلوب قرار دیا ہے۔''(۴)

مذکورہ بالا تعارف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مدعا نگاری، معیاری اسلوب، تحریروں میں اعتدال، تخیل و جذبات سے دوری، عقلیت کا ترازو وغیرہ ایسی اصطلاحات کا سمجھانا مشکل عمل ہے کیوں کہ ہر اصطلاح کے لیے بیسیوں امثال اور کثیر وقت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مزید یہ کہ تعارف میں مولانا الطاف حسین حالی کی مقصدیت اور سنجیدگی کی بات کی گئی ہے لیکن سبق میں جہاں مرزا غالب کے خصائل کا ذکر کیا گیا ہے وہاں مرزا غالب کی ظرافت اور لطائف کا ذکر ملتا ہے اور تحریر ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے چوں کہ مرزا غالب کی یہ سوانح عمری نہم کلاس کے سبق کے لیے نہیں لکھی تھی اس لیے اس کا اُسلوب اس درجے کے طلبا کے لیے نسبتاً مشکل ہے۔ اس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

> ''ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت، غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔۔۔ مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت موجود تھا۔ باوجود یکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، بایں ہمی کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔''(۵)

درسی کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سے ماخوذ ایک سبق ''شاعروں کے لطیفے'' کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اردو قواعد و انشا برائے نہم دہم میں جہاں واحد جمع بیان کیے گئے ہیں شاعر کی جمع ''شعرا'' تحریر ہے لیکن سبق کے عنوان میں شاعر کی جمع ''شاعروں'' دیا گیا ہے جس پر اکثر طلبہ درست اور موزوں لفظ کی بابت سوال کرتے ہیں اور اساتذہ کو یہ کہتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے کہ یہ لفظ یہاں کسی قدر غیر مناسب ہے۔ دوسری جانب مولانا محمد حسین آزاد کا تعارف بھی خاصا مشکل دیا گیا ہے اور ایک ہی پیراگراف میں ان کی نثر کے جملہ خصائص جن میں ''تمثیلی اسلوبِ بیان، تخیل آفرینی، پیکر تراشی، تجسیم نگاری، شعریت اور رنگینی، نفسیاتی حقیقت آرائی اور مبالغہ آرائی'' وغیرہ شامل ہیں، کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے کتاب کے مولفین کے وسیع علم کا تو اندازہ ہوتا ہے لیکن طلبہ کی تدریس میں مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ ایسی اصطلاحات کی تفہیم درحقیقت نہم جماعت کے طلبہ کے لیے ایک مشکل امر ہے:

> ''آزاد اردو کے صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ وہ اپنے اسلوبِ بیان کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کا تمثیلی اسلوبِ بیان انھیں اپنے عہد کے ادیبوں اور نثر نگاروں میں منفرد بناتا ہے۔ تخیل آفرینی، پیکر تراشی، تجسیم نگاری، شعریت اور رنگینی، واقعہ نگاری، نفسیاتی حقیقت آرائی اور مبالغہ آرائی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کا اندازِ بیان، نثر کا ایک ایسا خوب صورت اور دلکش شاہکار ہے، جس نے ان کے بعد آنے والے ادیبوں کی اکثریت کو متاثر کیا۔''(۶)

یہ سبق چوں کہ آبِ حیات سے لیا گیا ہے اور اس میں شعرا کے لطائف کی نوعیت خالصتاً ادبی ہے اس لیے کئی مقامات پر اس کی تفہیم پیچیدگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس سبق کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے جب بورڈ کے امتحان میں خلاصہ لکھنے کا کہا جاتا ہے تو طلبہ اس مشکل کا شکار دکھائی دیتے ہیں کہ مختلف شعرا کے لطائف، جن کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں، ان کا ایک خلاصہ کس طرح ممکن ہے؟ یہ امر نہ صرف اساتذہ بلکہ طلبہ اور ان کے والدین کے لیے بھی پریشان کُن ثابت ہوتا ہے۔ تلخیص نگاری کی تکنیک کے مطابق یہ خلاصہ ممکن نہیں ہے، البتہ اس سبق سے تفہیم کا سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک سبق جنرل

شفیق الرحمٰن کا انشائیہ ''ملکی پرندے اور دوسرے جانور'' ہے۔اس میں مختلف جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی وہ تمام بری عادات کا بیان ہے، جو عمومی طور پر انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔اب چوں کہ اس میں بھی مختلف جانوروں اور پرندوں کا ذکر ہے اس لیے اس کا ایک خلاصہ کرنا بھی مشکل ہے۔البتہ کھینچ تان کر کے طلبہ اس کا یہ حل نکالتے ہیں کہ اس میں بیان کردہ جانوروں کے نام یاد کر کے ان کی چیدہ چیدہ صفات خلاصے میں لکھ دیتے ہیں۔

سید امتیاز علی تاج کا تحریر کردہ ڈراما ''آرام وسکون'' بھی نصابی کتاب کا حصہ ہے لیکن اس میں ڈرامے کی ہیئت کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس میں پردہ اٹھنے کے بعد کا کوئی بھی منظر یا اہم یا ضمنی کردار دیے گئے ہیں۔یہ دونوں اجزا چوں کہ ڈرامے کا لازمہ ہیں اس لیے انھیں نظر انداز کرنا درست نہیں۔اس لیے یہ محض کہانی بن کر رہ جاتا ہے جس کو پڑھنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ اسے یاد کر کے اس میں موجود سوالات و جوابات کی نشاندہی کی جائے اور پاس ہونے کے نمبر لیے جائیں۔مزید یہ کہ تخلیقی سطح پر ڈراما پیش کرنے اور سمجھنے کے لیے نصاب میں کسی ورک شاپ کے اہتمام کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی سکول سطح پر اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔سید امتیاز علی تاج کا تعارف بھی گزشتہ ادبا کے تعارف کی طرز پر مشکل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''امتیاز علی تاج کے ڈراموں میں تمام لسانی خوبیاں موجود ہیں۔ان کی تحریر سادہ اور بے تکلّف ہے۔وہ الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔۔۔امتیاز علی تاج کرداروں کی تخلیق میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔وہ اپنے کرداروں کو نفسیاتی تجزیے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔وہ محض کٹھ پتلی نہیں ہوتے بلکہ جان دار، زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔امتیاز علی تاج کے ڈراموں میں چُستی، برجستگی اور بے ساختگی ملتی ہے۔''(۷)

امتیاز علی تاج کی نسبت مرزا دیب کے ڈرامے میں منظر اور کردار پیش کیے گئے ہیں۔اس ڈرامے کا موضوع پیچیدہ ہے۔ایک ایسا فن کار جو نہایت مفلوک الحال ہے، ایک امیر زادہ اسے سہارا دیتا ہے اور شہرت کماتا ہے۔وہ فن کار امیر ہو جاتا ہے تو اپنے ہی ایسے ایک غریب فن کار سے تصویریں بنا کر اپنے نام سے فروخت کرتا ہے۔یوں یہ دوطرفہ دھوکا ہوتا ہے۔ایسے میں اس کی ایک تصویر کو مقابلے میں اوّل انعام ملتا ہے تو وہ فن کار جس نے وہ تصویر حقیقت میں بنائی ہوتی ہے، خودکشی کر لیتا ہے۔اس ڈرامے کو کسی مزاحیہ ڈرامے یا آسان موضوع کے ڈرامے سے تبدیل کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ڈراما بھی آسانی سے پڑھا جاتا ہے اور نہم جماعت کی تدریس میں زیادہ مشکلات کا سبب نہیں بنتا۔مرزا فرحت اللہ بیگ کا انشائیہ ''امتحان'' بھی درسی کتاب میں شامل ہے جس میں ایک نکمے طالب علم کے امتحان میں فیل ہونے اور گھر والوں کو دھوکا دینے کی روئیداد موجود ہے۔یہ واضح طور پر انشائیہ ہے لیکن اسے مضمون کہا گیا ہے۔ان کے تعارف میں رشید احمد صدیقی کا ایک اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے لیکن اس اقتباس کا کوئی بھی حوالہ نہیں دیا گیا۔مزید یہ کہ تعارف میں ان کی دہلویت کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

> ''مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر سادہ اور پر لطف ہے۔وہ بڑے شگفتہ انداز میں دلی کی خاص زبان لکھتے ہیں۔ان کے اُسلوب میں تصنّع اور بناوٹ نام کو نہیں۔مزاح کی چاشنی، ان کی تحریر میں خاص لطف دیتی ہے۔''(۸)

کتاب کے حصہ نظم و غزل کی بات کی جائے تو سب سے زیادہ اخلاقی مسائل اسی میں نظر آتے ہیں۔حصہ غزل میں

پہلی غزل میر تقی میر کی ''ہستی اپنی حباب کی سی ہے'' ہے۔ یہ غزل اخلاقی پہلوؤں سے غیر مناسب ہے اور اساتذہ اور والدین دونوں کے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔ بالخصوص جہاں مخلوط تعلیم ہو، وہاں یہ مزید نفسیاتی الجھنیں بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ بہتر تھا کہ اس غزل میں درج ذیل اشعار کو حذف کر دیا جاتا یا پھر اس کی جگہ کوئی مناسب اخلاقی پہلوؤں کی حامل غزل شامل کر دی جاتی:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے(۹)

تیسرا شعر بھی خالصتاً مجاز کا رنگ لیے ہوئے ہے اور اس کو تشریح میں نہ چاہتے ہوئے بھی عشق کے پیچیدہ مسائل کا بیان ہو جاتا ہے۔

شامل نصاب ایک اور غزل خواجہ حیدر علی آتش کی ہے۔ غزل سے قبل ان کا تعارف ملاحظہ کیجیے جو کسی بھی طرح نہم جماعت کے طالب علم کے لیے تحریر کیا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ درج ذیل مشکل شعری و ادبی اصطلاحات کی تفہیم کے لیے ایک استاد اور شاگرد کو کس تکلیف سے گزرنا پڑتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں:

''ان کی غزلوں میں تغزل کی بیشتر خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی اپنے زمانے کے دیگر شعرا کی طرح شاعری کو شاعرانہ صناعی، مرصّع کاری اور الفاظ کی نگینہ کاری کہتے تھے۔ تاہم آتش کے ہاں عامیانہ و سوقیانہ پن دکھائی نہیں دیتا جو اس وقت کے لکھنوی شعرا کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ آتش کے کلام میں فقر و غنا، توکل، تصوف، دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی، درویشانہ رنگ اور اخلاقی مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں تغزل، رجائیت، سادگی و سلاست، نادر تشبیہات و استعارات، عمدہ صنائع بدائع، رندانہ موضوعات اور آتش بیانی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔''(۱۰)

آتش کی غزل ''رخ و زلف پر جان کھویا کیا'' کی بات کی جائے تو اس میں بھی اخلاقی مسائل موجود ہیں۔ جہاں ایک جانب اسی کتاب میں ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' جیسے نظم شامل کر کے طلبہ کو امید، حوصلہ، جرات اور آگے بڑھنے کا جذبہ دیا گیا ہے وہیں آتش کا یہ درس بھی شامل کیا گیا ہے کہ ان کے پاس زندگی میں محبوب کے دو ہونٹوں سے جھانکتے حسین دانتوں کے تصور میں غلطاں رہنے، ان کی تعریف کرنے اور تعریف میں زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اور یہ کام بھی گویا کوئی بہت بڑا کام ہے:

ہمیشہ لکھے وصفِ دندانِ یار
قلم اپنا موتی پرویا گیا(۱۱)

اس کے بعد آتش کا دوسرا سبق یہ پیش کیا گیا ہے کہ جب انھیں دانتوں کی تعریف سے فرصت ملتی ہے تو وہ محبوب کی ٹھوڑی اور اس پر پڑنے والے ہلکے گڑھے میں کھوئے رہتے ہیں۔ نہم جماعت کے طلبا و طالبات کی قومی زبان کی درسی کتاب میں ایسے موضوعات کی موجودگی اور اس کی تدریس یقیناً اخلاقی حوالوں سے نہایت تکلیف دہ عمل ہے۔

زنخداں سے آتش محبت رہی
کنویں میں مجھے دل ڈبویا کیا(۱۲)

مرزا غالب کی شاملِ نصاب غزل کا رنگ بھی مجاز ہی کا ہے۔ اگرچہ اس میں وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں محبوب سے اظہارِ محبت کرتے ہیں اور اس پر جان قربان کر دینے کی بات کرتے ہیں لیکن یہاں بھی طلبہ کے لیے محبت میں ایسا سب کچھ کر گزر جانے کا درس بہر حال موجود ہے۔ اس ضمن میں ان کے یہ تین اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں وہ پہلے خدا سے حیراں ہو کر سوال کرتے ہیں کہ وہ جب کہ محبوب سے بے حد محبت کرتے ہیں اور اس کے پیار کے محتاج و مشتاق ہیں تو وہ اس سے کیوں کر بے زار رہتا ہے۔ پھر وہ اپنے آپ پر افسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے اس سنگ دل بے وفا سے محبت کی جسے وفا کے معانی تک سے آشنائی نہیں اور پھر وہ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ وہ عملی طور پر محبوب پر جان نچھاور کرتے ہیں اور محض دعا کے سہارے تلاش نہیں کرتے۔ ان تمام اشعار کی تشریح عشق و محبت کے باب وا کیے بنا ممکن نہیں ہے۔ نہم جماعت کے طلبہ کی تدریس کو ذہن میں رکھ کر درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے(۱۳)

اسی درسی کتاب میں حیرانی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی شامل نصاب غزل ''لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیا میں'' میں سیماب اکبر آبادی کا ایک شعر غلطی سے شامل کر دیا گیا ہے لیکن کمال افسوس یہ ہے کہ کتاب کے کئی ایڈیشن چھپنے کے باوجود نہ تو اس کی کوئی تعزیر شائع کی گئی اور نہ ہی اسے غزل سے خارج کیا گیا ہے۔ شعر یہ ہے:

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں(۱۴)

جماعت دہم کی پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتاب کا جائزہ لیں تو اس کے نثری اسباق مشکل ہیں البتہ مصنفین کا تعارف اتنا مشکل نہیں ہے کہ دہم کلاس کے طلبہ اسے سمجھ نہ سکیں۔ اس کے مشکل ترین اسباق میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون ''اردو ادب میں عید الفطر'' خاصا مشکل اور ادبی نوعیت کا ہے۔ اس میں اردو نظم کے ارتقا میں موضوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب اُردو شاعری کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی اور
نظموں کی طرف توجہ تیز ہو گئی تو عید کے موضوع میں بھی اشاراتی اور علامتی امکانات زیادہ

اجاگر ہوئے اور اُردو شاعری کو ۱۸۵۷ء کے بعد ملی احساسات کی ترجمانی کا وسیلہ بھی بنایا گیا اور اس طرح مسلمانوں کی فکری زندگی کے خدو خال نے اُردو ادب میں اسلامی اقدار و روایات کی پاسداری کے عمل کو شدید سے شدید تر کر دیا۔ عیدالفطر پر نظموں کی کثرت کا سب بھی یہی ہے اور شعرا و ادبا نے جب تخلیقی جوہر کے حوالے سے ان کے افکار کی پیش کش کا سامان فراہم کیا تو یہ موضوع کئی جہتوں میں پھیل گیا۔'' (۱۵)

اس سبق کو پڑھتے ہوئے طلبا اکتاہٹ کا شکار نظر آتے ہیں کہ انھیں خالص لسانی مباحث کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کی تاریخ اور ارتقا کو بھی سمجھنا پڑتا ہے۔ اس میں دی گئی ادبی اصطلاحات اور مشکل لفاظی، طلباء کی توجہ بٹاتی ہیں۔ اسی سبق کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس رجحان نے تخلیقی سطح پر ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے موقع نہ ہوگا کہ عید کا تصور مسلمانوں کے ہاں محض تہوار منانے اور اچھل کود کو کلچر بنانے پر منحصر نہیں بلکہ اس خوشی کا رشتہ ہماری اقدار میں بہت دور تک جاتا ہے جس سے عید کے بارے میں اُردو شعرا کی تخلیقات کو ایک سمت ہی نہیں ملتی بلکہ ان کا تعلق ہمارے داخلی رویوں کے ساتھ اتنا گہرا ہے کہ ہماری شعری روایت میں یہ عمل صرف یک طرفہ مناظر کشی تک جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ عید کی شاعری ہماری شعری روایات کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔'' (۱۶)

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں کہ ایسے خالصتاً ادبی مضامین میں طلبا کی دلچسپی برقرار رہنا، اس کی تشریح کرنا یا خلاصہ لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اسی طرز کا ایک اور سبق ''استنبول'' از حکیم محمد سعید بھی خاصا مشکل سبق ہے اور اسی نسبت سے اس کا خلاصہ تحریر کرنا۔ اس سبق میں استنبول کی تاریخ اور اس کے سفر کا احوال درج ہے۔

شامل نصاب سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' دس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سبق گو کہ آسان ہے اور رنگِ مزاح بہت واضح ہے لیکن یہاں پھر سے امتحانی نقطہ نگاہ سے مسائل ہیں۔ اگر اس کے کمپوز کیے گئے دس صفحات کو ہاتھ سے لکھا جائے تو تقریباً پندرہ صفحات بنتے ہیں اور اس کا خلاصہ کم از کم چار سے پانچ صفحات پر مکمل ہوتا ہے جب کہ تلخیص دو اڑھائی اور زیادہ سے زیادہ تین صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ تین صفحات کی تلخیص بھی عموماً ناپسند کی جاتی ہے۔ اس لیے اس کی جگہ کوئی مختصر افسانہ شامل کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

دہم جماعت میں چوں کہ طلبہ نہم کے مقابلے میں زیادہ بہتر فہم و ادراک کے حامل ہو جاتے ہیں اس لیے اس کتاب کے اسباق سے زیادہ بحث نہیں کی جا رہی البتہ اس کتاب کا حصہ غزل خاصا مشکل ہے۔ فراق گورکھپوری کی شامل نصاب غزل نہایت عمدہ اور باکمال ہے کہ اس میں ہر مصرعے میں ایک بات کی جاتی ہے اور دوسرے مصرعے میں اس بات کو ایک نیا رنگ دے دیا جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ غزل دہم جماعت کے طلبا کے معیار سے بلند تر ہے۔ چوں کہ امتحان میں غزل کی تشریح مطلوب ہوتی ہے اس لیے ہر شعر کی الگ الگ تشریح کرنا اور اسے یاد رکھنا ایک مشکل امر ہے۔ ذیل میں مکمل غزل پیش کی جا رہی ہے:

سر میں سودا بھی نہیں ، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
یوں تو ہنگامے اٹھاتے ہیں دیوانہ عشق
مگر اے دوست ، کچھ ایسوں کا ٹھکانہ بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمارِ شکیبا بھی نہیں
رنگ وہ فصلِ خزاں میں ہے کہ جس سے بڑھ کر
شانِ رنگینی حسن آرا بھی نہیں
بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کُنجِ زنداں بھی نہیں ، وسعتِ صحرا بھی نہیں(۱۷)

جگر مرادآبادی کی غزل ''آدمی آدمی سے ملتا ہے'' نسبتاً آسان غزل ہے اور سات اشعار پر مشتمل ہے لیکن اس میں پہلے اور چھٹے شعر کے علاوہ باقی تمام اشعار خالصتاً مجاز کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ کہیں وہ کہتے ہیں کہ محبوب کا وجود اور قامت دونوں فتنہ قیامت سے مشابہ ہیں، کہیں لکھتے ہیں کہ پھولوں کا رنگ محبوب کی ہنسی سے ملتا ہے، کہیں یہ کہ محبوب کو دیکھ کر وہ اس کے سارے ظلم وستم بھول جاتے ہیں اور کہیں یہ کہ محبوب اگر چہ مل کر بھی نہیں ملتا لیکن دل اسی سے ملتا ہے۔ ادا جعفری کی شامل نصاب غزل گو کہ مشکل مضامین کی حامل ہے لیکن عمدہ بھی ہے اور دہم جماعت کے طالب علموں کے ذہنی استعداد سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ یوں ثانوی نصابِ تعلیم اُردو کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حصوں کو طلبہ کی ذہنی استعداد کے مطابق ترتیب نہیں دیا گیا۔ اس لیے اسے نا صرف آسان فہم بنانا چاہیے بلکہ طلبہ کی دلچسپی کے امور کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد دہلوی، سید، فرہنگِ آصفیہ، جلد چہارم، لاہور: مطبع رفاہِ عام، ۱۹۰۸ء، ص: ۵۶۷
۲۔ اُردو برائے جماعت نہم: مولفہ: مجلس مرتبین، لاہور: برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ۲۰۱۶ء، ص: ۱
۳۔ ایضاً، ص: ۲۔۳
۴۔ ایضاً، ص: ۷
۵۔ ایضاً، ص: ۸
۶۔ ایضاً، ص: ۲۱
۷۔ ایضاً، ص: ۴۶
۸۔ ایضاً، ص: ۶۹
۹۔ ایضاً، ص: ۱۲۵
۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۳۰
۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۳۱

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً،ص:۱۳۶

۱۴۔ ایضاً،ص:۱۴۱

۱۵۔ اُردو برائے جماعت نہم: مولفہ: مجلس مرتبین، لاہور: برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ۲۰۱۸ء،ص:۴۲

۱۶۔ ایضاً،ص:۴۴

۱۷۔ ایضاً،ص:۱۵۷

☆.....☆.....☆